R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷۔ شمارہ ۱۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ اپریل ۱۹۶۸ء

اداریہ

گورکی کی یادیں

۲۸ مارچ ۱۹۶۸ء کو گورکی کا صد سالہ جنم دن تھا۔ یہ جنم دن سوویٹ یونین کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی منایا گیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے کئی شہروں میں، اور یونیورسٹیوں میں گورکی کی یاد میں جلسے کئے گئے اور اس کی عظمت کی طرف اشارے ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی ۳ اپریل کو ایک خاص جلسہ ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر کی صدارت میں ہوا۔ سوویٹ یونین کی سفارت کے تہذیبی مشیر نے شرکت کی۔ اس موقع پر اردو ادب پر گورکی کا اثر، گورکی کے ڈرامے [illegible] (LOWER DEPTHS) کا ایک مطالعہ، گورکی کی زندگی اور تصانیف کے کچھ پہلو، گورکی کی عظمت، پر مقالے پڑھے گئے اور تقریریں ہوئیں۔ اس کے علاوہ گورکی کی آپ بیتی کے اردو ترجمے سے کچھ اقتباسات اور اس کے ڈرامے کے انگریزی ترجمے سے ایک ٹکڑا سنایا گیا۔ روس کے ممتاز مصنفین کی تصاویر اور گورکی کی تصانیف کے اردو، ہندی اور انگریزی میں ترجموں کی نمائش بھی کی گئی۔

گورکی ایک طرف روس کے عظیم مصنف ٹالسٹائی، داستوفسکی، چیخوف کے سلسلے کو مکمل کرتا ہے اور دوسری طرف جدید روسی ادب کا پیش رو ہے۔ اس نے جب آنکھ کھولی تو روس میں عوام کی حالت بہت خراب تھی۔ بچپن میں اسے بڑی سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر وہ اپنی دھن کا پکا تھا۔ برابر جدوجہد کرتا رہا۔ انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے اس کی کہانیوں کی طرف توجہ شروع ہو گئی تھی۔ وہ تمام انسانوں سے بڑی محبت کرتا تھا اور اس لیے جب اپنے گرد و پیش انسانوں کی پستی اور زبوں حالی دیکھتا تھا تو بہت تلخ ہو جاتا تھا۔ گورکی کے معنی ہی روسی میں تلخ کے ہیں۔ شروع میں اس تلخی پر بڑے اعتراضات ہوئے، مگر کچھ عرصے بعد اس تلخی کی شیرینی کا احساس ہونے لگا۔ گورکی نے نہ صرف روس کے مختلف حصوں کی سیر کی، بلکہ اپنی زندگی کا خاصا حصہ روس سے باہر فرانس اور اٹلی میں گزارا۔ اس کی ناول "ماں" کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کی آپ بیتی تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا میرا بچپن، دوسری کا تربیت کا دور اور تیسری کا میری یونیورسٹیاں۔ کئی نقادوں کے نزدیک گورکی کی آپ بیتی اس کا شاہکار ہے۔ گورکی سے لینن کی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور لینن اس کا خاصا قائل تھا۔ اسٹالن بھی اس کا خیال کرتا تھا۔ جب انقلاب کے جوش میں روس کے مصنفین ٹالسٹائی وغیرہ کو طاق نسیاں پر رکھنے کی تلقین کر رہے تھے اور کلاسیکی روسی ادب کو برا بھلا کہا جا رہا تھا، گورکی نے ان کی عظمت کا احساس دلایا۔ کچھ متشدد لوگ اس کے بھی مخالف ہو گئے تھے اور اگر اسٹالن سے اس کے اچھے تعلقات نہ ہوتے تو اسے بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ گورکی کی وہ تصانیف جن میں نچلے طبقے کے افراد کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں، جن میں ایک بے رحم حقیقت نگاری ملتی ہے، یا جن میں تمثیلی انداز میں زندگی کے مختلف پہلو پیش کئے گئے ہیں، غیرفانی ہیں۔ وہ بہت بڑا انسان دوست ہے۔ اسے آدمی کی ہر شکل سے محبت ہے۔ یہاں تک کہ وہ آوارہ اور خانہ بدوش اشخاص سے بھی محبت رکھتا ہے۔ اس کے یہاں انسان کی عظمت پر ایک ناقابل تسخیر یقین ملتا ہے۔ فن کار گورکی اور محنت کش نامہ نگار گورکی یا انقلاب روس کے مبلغ گورکی میں فرق ہے۔ اس کے وہ مضامین جن میں اس نے اشتراکی حقیقت نگاری کی تبلیغ کی ہے یا جن میں محنت کش عوام کی برتری کا اعلان کیا ہے، ایک زمانے میں بہت مقبول تھے، مگر آج ان کی وہ اہمیت نہیں جو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں تھی۔ بات یہ ہے کہ بڑا ادب کسی ایک ملک یا زبان کی ملکیت نہیں ہوتا۔ وہ عالمی سرمائے کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ گورکی کے کئی ناولوں اور افسانوں میں اور اس کی آپ بیتی میں فکر و فن ایک دوسرے میں اس طرح حل ہو گئے ہیں اور ان میں ایسی تخلیقی حرارت ہے کہ وہ آج بھی اپنی اہمیت سبھی سے منوا لیتے ہیں۔ پھر اس کے یہاں انسان دوستی کی وجہ سے ایک آفاقیت آ گئی ہے جو ملکوں، طبقوں اور مذاہب کی حد بندی سے بلند ہے۔ اردو میں گورکی کی بیشتر تصانیف کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ انگریزی سے بھی اور براہ راست روسی سے بھی۔ ماں، اور آپ بیتی کا ترجمہ تو دو دفعہ ہوا ہے۔ اردو ادب کی ہمیشہ یہ خوبی رہی ہے کہ وہ عالمی ادب سے برابر اثر قبول کرتا رہا ہے، چنانچہ ٹالسٹائی، داستوفسکی، چیخوف اور گورکی کے تراجم آج بھی اردو والے بڑے شوق سے

پڑھتے ہیں۔ ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ جو ادب دوسرے ادبیات سے بہت کچھ لیتا ہے وہی بالآخر دوسرے ادبیات کو بہت کچھ دینے کے بھی قابل ہوتا ہے۔ امید ہے کہ عالمی ادب کے شاہکاروں کا ترجمہ اردو میں برابر ہوتا رہے گا اور پھر اردو کے شاہکاروں کا دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی شروع ہو سکے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ غالب کے روسی زبان میں ترجمے کا کام شروع ہو چکا ہے اور بڑے پیمانہ پر غالب کی صد سالہ برسی وہاں اور دوسرے ملکوں میں منائی جائے گی۔

حیدرآباد میں غالب ہال تعمیر ہوگا

حیدرآباد۔ غالب کے صد سالہ جشن کے سلسلے میں حیدرآباد میں جو کام ہو رہا ہے اس میں غالب ہال کی تعمیر بھی ہے۔ یہ ہال پرانے شہر کے محلہ مغل پورہ کی اس زمین پر تعمیر ہوگا جو انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی ملکیت ہے۔ تعمیری اخراجات کی فراہمی کے سلسلے میں طے کیا گیا ہے کہ حکومت آندھرا پردیش، مرکزی حکومت، میونسپل کارپوریشن، نظام جیوبلی ٹرسٹ اور عوامی حلقوں سے سرمایہ فراہم کیا جائے۔ (ترقی اردو)

غالب کا تلگو میں ترجمہ

آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی نے غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر غالب کی پچیس منتخب غزلیں تلگو رسم خط میں ان کے اردو ترجمے کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ علاوہ بریں غالب کے فکر و فن سے متعلق ایک کتاب بھی شائع کی جائے گی جس کے نگراں ڈاکٹر مسعود حسین خاں مقرر کئے گئے ہیں۔ اکاڈمی نے اعلان کیا ہے کہ غالب کی زندگی سے متعلق ایک ڈرامہ بھی لکھایا جائے گا جس پر (۱۱۱۶) روپیہ انعام دیا جائے گا۔ (ترقی اردو)

ہندی کی اشاعت کے لئے پانچ لاکھ رضاکاروں کی بھرتی

آگرہ۔ اس سال کے آخر تک الہ آباد کی ہندی ساہتیہ سمیلن پانچ لاکھ رضاکار بھرتی کرے گی جو ہندی کا پرچار کریں گے۔ یہ رضاکار مختلف علاقوں میں اور خصوصیت سے جنوبی علاقوں میں بھیجے جائیں گے۔ اس کا صدر دفتر دہلی میں ہوگا اور شاخیں سارے ہندوستان میں ہوں گی۔ یہ رضاکار غیر ہندی علاقوں میں ہندی کو فروغ دینے کی کوشش کریں گے۔ (الجمعیۃ)

اردو آرٹس کالج کے لیے ایک لاکھ روپیہ کی مالیت کی زمین کا عطیہ

حیدرآباد۔ ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس کالج نے کالج کے جلسۂ سالانہ میں اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ پروفیسر حبیب الرحمٰن سکریٹری انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے (جو اردو آرٹس ایوننگ کالج کے بھی سکریٹری ہیں) کالج کی عمارت کے لیے ایک لاکھ روپیہ مالیت کی زمین کا عطیہ دیا ہے۔ کالج کی عمارت کا کام بہت جلد شروع ہو جائے گا۔ روپیہ کی فراہمی کی مہم عنقریب شروع کر دی جائے گی حکومت اور اردو دوستوں سے توقع ہے کہ وہ وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل میں ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے۔ (نامہ نگار)

تذکرۂ طبقات الشعراء کی اشاعت

تذکرۂ طبقات الشعراء مؤلفہ قدرت اللہ شوق جس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد، اسٹیٹ آرکائیوز آفس (دفتر دیوانی و مال) حیدرآباد اور کتب خانہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں محفوظ ہیں اسال ہی میں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کر دیا ہے اسے جناب نثار احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے انھوں نے اس کے آغاز میں ستر صفحات پر مشتمل مقدمہ لکھا ہے۔ اس تذکرے پر مفصل حواشی اور تعلیقات بھی فراہم کئے گئے ہیں جو دوسری جلد میں "تعلیقات طبقات الشعراء" کے نام سے شائع ہوں گے۔ (ہماری زبان)

صولت ٹونکی کی وفات

ادبی حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج و غم کے ساتھ سنی جائے گی کہ راجستھان کے مشہور استاد سخن جناب مولانا سید محمود الحسن صاحب صولت ٹونکی کا ایک طویل علالت کے بعد ۲۹ مارچ کو بعد نماز فجر انتقال ہو گیا آپ کی عمر ۷۰ سال کی تھی۔ ان کی وفات نے اہل ٹونک کو ایک دیدہ ور شاعر سے محروم کر دیا۔

(سید سعید احمد برکاتی)

سکندر علی وجد

آج

آج پر نظر رکھئے

اصل زندگی ہے یہ — دورِ مختصر اس کا
تابناک و بے پایاں — وقت کے اندھیرے میں
گم ہوا گزشتہ کل — خواب آنے والا کل

آج پر نظر رکھو

اس طلسم حیرت میں — عہد آخریں ماضی
شاندار مستقبل — ارتقاء کا ہر منظر
قافلے بہاروں کے — نوجواں حسیں دنیا

آج پر نظر رکھو

رحیم علی الہاشمی

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے ساتھ پانچ سال

۱۹۳۱ء میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے استعفیٰ دے کر میں دلی گیا کہ وہاں کوئی اور روزگار تلاش کروں تو منجملہ اور لوگوں کے مرحوم مولوی عبدالحق سے بھی ملا۔ ان کا احترام میرے دل میں طالب علمی کے زمانے سے تھا مگر ان سے تعارف پہلی مرتبہ حیدرآباد میں ہوا۔ میں نے اپنی کتاب "مضمون نگاری" کے چار حصے عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کرنے کی منظوری کے لیے بھیجے تھے اور وہاں ان پر جن لوگوں سے رائے لی گئی ان میں مرحوم مولوی صاحب بھی تھے جنھوں نے اسے پسند فرما کر محکمہ کو بھیج دیا اور جب ایک صحبت میں میرا ان سے تعارف کرایا گیا تو انھوں نے زبانی مجھ سے میری کتاب کی تعریف کی۔ اس کے بعد پھر میں نواب ذوالقدر جنگ مرحوم کے ہمراہ ان سے دلی میں ملا جب کہ وہ کوٹھی القمرشی میں مقیم تھے اور ابھی انجمن کا دفتر پورے طور پر دلی نہیں آیا تھا۔ اس طرح اب دلی دریا گنج میں یہ میری تیسری ملاقات تھی اور میرا خیال تھا کہ اگر انھیں میری ضرورت ہوئی تو وہ ضرور کہیں گے لیکن اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوئی اور باوجودیکہ مرحوم نہایت شفقت و اخلاق سے پیش آئے میں نے اس قسم کی کوئی درخواست نہیں کی اور سرِدست کوئی اور صورت سامنے نہ ہونے کی وجہ سے حاجی منظور علی صاحب کے آرمی پریس میں اسسٹنٹ منیجری کی جگہ منظور کی اور وہیں پریس کی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد چند مرتبہ مولوی صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا مگر پھر بھی انجمن میں ملازمت کی کوئی درخواست نہیں کی۔ چند مہینوں کے بعد انجمن کے منیجر کا ٹیلیفون آیا کہ مولوی صاحب مرحوم مجھ سے ملنا چاہتے ہیں چنانچہ شام کو جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے مجھے ہاشمی فرید آبادی صاحب کے پاس بھیجا جنھوں نے مجھے نشر و اشاعت و مطبوعات کے نگراں کا عہدہ پیش کیا جسے میں نے فوراً منظور کر لیا اس لیے کہ مرحوم مولوی صاحب کے ساتھ انجمن میں کام کرنا میں اپنے لیے باعثِ عزت سمجھتا تھا مگر چونکہ مشاہرہ میری مرضی کے موافق نہ تھا اس لیے میں نے ایک شرط یہ پیش کی کہ دفتر کے اوقات کے علاوہ مجھے اور کام کرنے کی اجازت دی جائے اور ان اوقات میں جو چیز انجمن کے لیے لکھوں اس کا معاوضہ مجھے ماہوار مشاہرہ کے علاوہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ میرے بیوی بچے علی گڑھ میں ہیں اس لیے ہر ہفتہ علی گڑھ جایا کروں گا اور پیر کی صبح کو واپس آیا کروں گا۔ میری یہ دونوں شرطیں منظور کر لی گئیں اور دوسرے دن سے میں نے کام شروع کر دیا۔ چند ماہ بعد دفتر کی کوٹھی میں ایک کمرہ خالی ہوا تو میں اسی میں منتقل ہو گیا۔ اس کمرے سے متصل ایک کمرے میں غسل خانہ اور کموڈ تھا اور اسی میں ایک کونے میں میں نے اپنی نماز پڑھنے کی جگہ اور کھانا پکانے کی جگہ بھی بنا لی اس لیے کہ اس کا چھوٹا برآمدہ دھوپ کے رخ پر تھا۔ اوپر کے کام میں مجھے تین چیزیں انجمن کی طرف سے مجھے کو دی گئیں یعنی فن صحافت اور مردم شماری اور [illegible] جو میں نے دو سال میں ختم کیں اور اس کے بعد اردو انگریزی لغت کی تدوین کا کام ہوا جو میں نے اس کے بعد دو سال میں ختم کیا اور اس کا نصف حصہ ٹائپ شدہ اور نصف حصہ مسودہ کی شکل میں مولوی صاحب مرحوم اپنے ساتھ پاکستان لیتے گئے۔

دفتر میں مجھے نشر و اشاعت اور مطبوعات کی نگرانی کے علاوہ پبلسٹی پمفلٹ اردو اور انگریزی میں لکھنا انجمن کی سالانہ رپورٹ لکھنا اور خاص خاص خطوط جو دفتری عملہ کی استعداد سے باہر ہوتے لکھنا ہوتا تھا بعض خطوط یا خاص اہمیت کے مجھے خود ہی ٹائپ کرنا ہوتا تھا اس لیے ایک ٹائپ رائٹر اور ٹیلیفون میری ہی میز پر ہوتا تھا۔ اکثر خطوط وہ مجھی سے کہتے تھے کہ تم خود ہی لکھ دو اور ان پر دستخط کر کے بھیج دیتے تھے۔ عموماً میں بہت محنت سے خط لکھتا تھا تو وہ فرماتے تھے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ خط پڑھتے ہوئے کیسے جواب لکھ دیتے ہو۔ ایک مرتبہ ایک طویل خط کے جواب میں ایک بات رہ گئی تو فرمایا کہ یہ بغیر خط پڑھے ہوئے جواب لکھنے کا نتیجہ ہے۔ بعد کو انجمن نے اردو کے امتحانات جاری کیے تو ان کی رجسٹراری کا کام بھی میرے ہی سپرد کیا گیا۔ میرے ہر ہفتہ علی گڑھ جانے کے بارے میں مرحوم اکثر فرماتے کہ آج ان کے سر پر سنیچر سوار ہے۔ مجھ سے ان کا برتاؤ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ شام کی چائے پر اور جب کبھی کوئی باہر کا آدمی آتا تھا تو مجھے ضرور یاد فرماتے تھے۔ اس طرح مجھے ملک کی بہت سی عظیم ہستیوں سے ملنے کی عزت حاصل ہوئی۔ شام کی چائے پر تقریباً روزانہ کچھ لوگ باہر کے مہمان ہوتے تھے۔

مرحوم اکثر بڑے پیمانہ پر ایٹ ہوم دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک روسی ثقافتی وفد ہندوستان آیا جس کے لیڈر ڈاکٹر [illegible] تھے اور مرحوم نے اس وفد کو ایٹ ہوم دیا۔ میز پر پھل اور پھلوں کے امرود بھی تھے اور ڈاکٹر [illegible] نے بتایا کہ اس پھل کو روس میں بھی امرود کہتے ہیں (غالباً ان کا مطلب ترکستان سے تھا) ایک مرتبہ متعدد معززین کے ساتھ مسز نائیڈو مرحومہ بھی مدعو تھیں اور دوران گفتگو میں انھوں نے کہا کہ مجھے روز ہوائی جہاز سے انھیں کہیں جانا ہے اس پر ایک من چلے مہمان نے کہا تو کل آپ اڑائی جائیں گی۔ مسز نائیڈو نے فوراً انگریزی میں جواب دیا: ابھی تک تو کوئی کامیاب نہیں ہوا۔ اب میں ساٹھ سال کی ہوں، تم کوشش کر کے دیکھو؟

اسی دوران میں ہندوستان کو اختیارات حکومت دیے کی گفت و شنید شروع ہوئی۔ انگلستان سے کیبنٹ مشن آیا اور ہندوستان کے لیڈروں سے گفتگو شروع ہوئی تو شام کو میرے بعض اخبار نویس احباب میرے کمرے پر جمع ہوتے اور دن بھر کی ساری باتیں تفصیل سے بتاتے اور اگر دن میں کوئی بہت ہی اہم بات ہوتی تو ٹیلیفون پر مجھے اسی وقت بتا دیتے۔ یہ سب میں صبح کو مولوی صاحب مرحوم سے بتاتا تھا اور وہ بڑی دلچسپی سے سنتے تھے اور تبصرہ کرتے تھے۔

اکثر احباب ٹیلیفون پر انگریزی یا عربی وغیرہ الفاظ کے اردو معنی دریافت کرتے تھے۔ عام طور پر میں خود ہی ان کی تشفی کر دیتا تھا۔ نہ کر سکتا تو مولوی صاحب مرحوم سے پوچھ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے VICIOUS CIRCLE کا ترجمہ دریافت کیا میرے ذہن میں کوئی

موزوں لفظ نہ آیا تو میں نے انھیں ٹیلیفون پر روک کر کہا کہ میں مولوی صاحب سے دریافت کروں، چنانچہ میں نے مرحوم سے دریافت کیا مگر وہ بھی معذور ہوگئے تو میں نے عرض کیا کہ میری سمجھ میں ایک لفظ آیا ہے، حکم ہو تو عرض کروں، فرمایا کہ ضرور کہو تو میں نے کہا کہ میرے نزدیک اس کا بہترین ترجمہ "چوتیہ چکّر" ہے۔ مولوی صاحب پھڑک اٹھے اور کھڑے ہو کر فرمایا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے عرض کیا کہ میں سوال کرنے والے صاحب سے کہہ دوں کہ مولوی صاحب نے یہ ترجمہ بتایا ہے۔ فرمایا "ارے نہیں، نہیں، کیا مجھے مروائے گا۔"

مولوی صاحب مرحوم ہر شخص سے نہایت اخلاق اور خلوص سے ملتے تھے لیکن جب کبھی کسی بات پر برہم ہوتے تو کسی کو نہ بخشتے تھے۔ انجمن کے دفتر میں ہاشمی فرید آبادی کے علاوہ علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی بھی رہتے تھے اور کیفی عمر میں مولوی صاحب سے کافی بڑے تھے لیکن دونوں گہرے دوست اور رفیق تھے۔ مگر ۸۱ دریا گنج سے انجمن کے انتشار کے بعد وہ زیادہ دن زندہ نہ رہے اور انجمن کا کام مولوی صاحب مرحوم کی جگہ ہندوستان میں جاری رکھنے کی تمنا دل میں لئے ہوئے انتقال کر گئے۔ ایک دن داغ کی شاعری پر مولوی صاحب مرحوم سے ان سے بحث ہو گئی، دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے تھے۔ آخر میں مولوی صاحب نے جھلا کر کہا کہ اچھا اب میں لکھ کر اس پر بحث کروں گا۔ جن لوگوں سے وہ ناراض ہوتے تھے انھیں "جھڑ ونس" کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔ جن لوگوں کے لئے انھوں نے میرے سامنے یہ لفظ استعمال کیا ان کا نام لینا میں مناسب نہیں سمجھتا لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے میں کتنے سخت ہوتے تھے۔

ایک دفعہ معین احسن جذبی صاحب مولوی صاحب سے ملنے آئے۔ دوران گفتگو میں نے سوال کیا کہ جذبی کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ مرحوم نے جذبی صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ ان سے پوچھو، مگر جذبی صاحب بیچارے مرحوم کے سامنے کیا زبان کھولتے، وہ خاموش رہے تو مولوی صاحب نے خود ہی فرمایا "جذبی نے غزل کو زندہ کر دیا ورنہ غزل تو مر گئی تھی۔"

ایک مرتبہ میں نے اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری کی ایک سو تیرہ غلطیاں نکال کر انھیں دکھائیں تو وہ انتہائی آزردہ ہوتے ہوئے کہ فرمایا کہ سب جلا دو اور اسی خفگی کی بنا پر انھوں نے انجمن کی مطبوعات کے تیرہ بکس جو مختلف ذرائع سے پاکستان روانہ کئے ان میں تقریباً تین سو مطبوعہ ڈکشنری کی جلدیں شامل نہیں کیں جو بعد کو میں نے مولانا آزاد مرحوم کے حکم سے ساڑھے سات ہزار روپیہ میں فروخت کر کے روپیہ ڈپٹی کمشنر دلی کے پاس رکھوا دیا اور جب قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم انجمن کے سکریٹری مقرر ہوئے تو وہاں سے منگوا کر قاضی صاحب مرحوم کے حوالے کر دیا۔

ابھی دلی میں ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا کہ مولوی صاحب مرحوم کو بعجلت جانا پڑا اور وہاں سے پاکستان چلے گئے۔ ہاشمی فرید آبادی صاحب، پنڈت کیفی صاحب اور دیگر دفتری عملہ کے لوگ پہلے ہی کوٹھی چھوڑ کر جا چکے تھے اور صرف مولوی صاحب مرحوم کے ذاتی ملازمین، ایک بوڑھا کاتب اس کی بیوی جو دق کے آخری درجے میں تھی اور اس کی دو بھولی لڑکیاں رہ گئی تھیں اور ساری ذمہ داری میرے سر پڑ گئی لیکن مجھے بھی ۱۰ ستمبر کو ایک فوجی کپتان نے وہاں سے نکال کر میرے ایک دوست سید محمد جعفری صاحب کے یہاں محلہ کوچہ چیلان میں پہنچا دیا۔ دوسرے دن بوڑھا کاتب اور اس کی بیمار بیوی اور بچیاں قتل کر دی گئیں اور ان کی لاشیں کوٹھی کے پیچھے نالے میں پھینک دی گئیں۔ اور سامان جو کچھ لوٹنے والا تھا لوٹ لیا گیا۔ میں صرف ایک قمیص اور پتلون پہنے ہوئے کوٹھی سے نکلا تھا وہی میرے پاس رہ گئے باقی سارا سامان کپڑے برتن کتابیں وغیرہ لوٹ لی گئیں۔ مجھے انجمن کی لائبریری کی فکر ہر وقت بے چین کئے رہتی تھی چنانچہ میں نے جعفری صاحب کو ساتھ لے کر تین دن چکر لگایا اور مولانا آزاد مرحوم کی وساطت سے ۸۱ دریا گنج پر فوج کا پہرہ بٹھوا دیا۔

اس دوران میں مولوی صاحب مرحوم پاکستان سے واپس آگئے اور چند دن گل رعنا میں پاکستانی ہائی کمشنر کے ساتھ مقیم رہے۔ میں باوجود شہر کی فضا خراب ہونے کے وقتاً فوقتاً ان سے ملتا رہا اور لکھنے پڑھنے کا جو کام ہوتا وہ کرتا رہا۔ شہر کی فضا کی خرابی کے باوجود مولوی صاحب مرحوم معہ اپنی ترکی ٹوپی کے صبح کی چہل قدمی کے لئے نئی دلی کی مختلف سڑکوں پر جانے لگے۔ ایک دن راستے میں انھیں ایک سکھ ملا اور اس نے حیرت سے دریافت کیا کہ آپ کس طرح یہاں ٹہل رہے ہیں جبکہ شہر کی فضا اتنی خراب ہو رہی ہے۔ مرحوم نے نہایت متانت سے کچھ جواب دیا اور دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔ مرحوم کے اخلاق کا سکھ اس قدر گرویدہ ہو گیا کہ دونوں میں دوستی ہو گئی اور پھر دونوں ساتھ ساتھ صبح کی چہل قدمی کے لئے جانے لگے اور پھر مرحوم چند دن قیام کر کے پاکستان واپس چلے گئے۔

اس دوران میں کوٹھی ۸۱ دریا گنج کے مالک لالہ راج کشن جین نے انجمن کی لائبریری اور بچا کھچا سامان دو کوٹھریوں میں بھر کر کوٹھی ایک بیمہ کمپنی کو کرایہ پر دے دیا۔ شہر کے حالات کچھ سدھرنے پر مرحوم پاکستان سے واپس آئے اور مطبع مجتبائی چوڑی والان میں مقیم ہوئے اور کتابیں وغیرہ جو کوڑے کرکٹ کی طرح دو کوٹھریوں میں بھری تھیں انھیں ترتیب دینے کا کام چند دیگر افراد کے ساتھ میرے سپرد کیا۔ پہلے دن جب وہ کوٹھی پر گئے تو جن کمروں میں وہ رہتے سہتے تھے ان میں کلرکوں کی میزیں لگی دیکھ کر بیقرار ہو گئے مگر بے حد ضبط کے بعد نمناک آنکھوں سے صرف اتنا کہا کہ ایسے بیٹھے ہیں جیسے ان کے باپ کا گھر ہو۔ جب تک مولوی صاحب دلی میں رہے میں روزانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور ان کا جو کچھ کام لکھنے پڑھنے کا ہوتا وہ انجام دیتا رہا۔ چند روز قیام کے بعد اور بچے ہوئے سامان میں سے ضروری چیزیں لے کر مستقل طور پر پاکستان چلے گئے۔ ایک دوست کی ذمہ داری میں ان کے پانچ سو روپے رکھے تھے وہ تھوڑی تھوڑی کر کے روپے منگواتے تھے جو اس وقت ان کے بہت کام آئے۔ اس وقت میں [illegible] میں کام کرتا تھا اور مولانا آزاد مرحوم کے حکم سے انجمن کی لائبریری علی گڑھ منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ تیرہ ٹرکوں میں کتابیں لاد کر علی گڑھ پہنچائی گئیں۔ تین تین ٹرکیں دن بھر لادی جاتی تھیں اور رات کو دلی سے روانہ ہو کر دوسرے دن علی الصباح علی گڑھ پہنچتی تھیں۔ دو تین ہفتے میں یہ کام انجام پا گیا اور انجمن سے میرے تعلق کا آخری سلسلہ ختم ہو گیا۔ اسی دوران میں میری بیوی ہیضہ کا شکار ہوئی اور گرنے سے ان کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی جس سے کئی دن تک وہ صاحب فراش رہیں مگر میں انجمن کی لائبریری منتقل کرنے کے سلسلے میں اتنا الجھا رہا کہ ان کی دیکھ بھال نہ کر سکا۔

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

جدید شاعری سے متعلق اب بعض اعتراضات عمومی حیثیت اختیار کرچکے ہیں، مثلاً یہ کہ یہ شاعری مبہم ہوتی ہے اور ابلاغ و ترسیل کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی، یہ مغرب کی بعض ایسی تحریکوں کی بھونڈی نقالی ہے جو خود مغرب میں بھی ازکار رفتہ ہو چکی ہیں، یہ شاعری اپنے ملک کے تہذیبی و سماجی عوامل کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ان موضوعات و مسائل کو پیش کرتی ہے جو مغرب میں تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں، جدید شاعری کے علمبردار کچھ برخود غلط اور گمراہ کردہ نوجوان ہیں جو اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے اپنے ادب کی مسلمہ روایات سے انحراف کر رہے ہیں، ان معترضین کا یہ خیال بھی ہے کہ یہ شاعری ہمارے یہاں قبول عام کا درجہ نہیں حاصل کر سکتی۔

اس قسم کے اعتراضات اگر ہرگنوری جیسے روایتی شعراء کی طرف سے ہوتے تو ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی لیکن اب اس طرح کے اعتراضات ہمارے ان بزرگوں کا بھی تکیہ کلام بنتے جا رہے ہیں جو خود کسی زمانے میں جدید ذہن کی علامت تصور کیے جاتے تھے اور جن کے اجتہادات و اختراعات کا تسلسل ہی نئی شاعری کو اس منزل تک لے آنے کا ذمہ دار ہے۔ میں حضرت فراق گورکھپوری کی شاعری اور ان کی تنقید دونوں کا بہت قائل ہوں اور ان کی ذہانت و فطانت اور نکتہ رسی کا بارہا اعتراف کر چکا ہوں لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کچھ دنوں پہلے ایک ملاقات کے دوران میں ان کی زبان سے بھی اس قسم کی بعض باتیں سننے میں آئیں۔ اس ملاقات میں بعض مسائل پر کھل کر باتیں ہوئیں اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ فراق صاحب نے آخر میں ان تمام باتوں سے اتفاق کیا جو میری اور ڈاکٹر وحید اختر کی طرف سے پیش کی گئیں۔ اس صحبت میں جناب مخدوم محی الدین اور جناب نشور واحدی بھی شریک تھے اور ان حضرات نے بھی جدید شاعری سے متعلق ہمدردانہ غور و فکر پر اپنے آپ کو آمادہ پایا۔

فراق صاحب سے اس ملاقات کی یاد ابھی ذہن میں تازہ ہی تھی کہ اتفاقاً میرا ہاتھ اپنے بک شیلف کی طرف اٹھ گیا اور میں نے ایک پرانی کتاب کو جو برسوں پہلے پڑھی تھی اٹھا کر پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ اس کتاب کا نام ہے "نیا ادب میری نظر میں"۔ یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نیا ادب اور نئی شاعری سے متعلق لکھے گئے تھے اور آغا سرخوش قزلباش نے ۱۹۴۴ء میں یکجا کر کے نگارستان بک ایجنسی دلی سے شائع کیے تھے۔ اس کتاب کے بعض مضامین پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ نیا ادب اور نئی شاعری کے نام سے جو بھی رجحانات شروع ہوتے ہیں ان کے متعلق شکوک و شبہات کی نوعیت قریب قریب یکساں ہوتی ہے۔ یہاں بعض اقتباسات کا اعادہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

نواب جعفر علی خاں اثر فرماتے ہیں:

"ان لوگوں کا مفروضہ ادب برائے زندگی دراصل روسی اشتراکی لٹریچر کا بگڑا ہوا خاکہ ہے جسے خود روس پچاس برس پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ ایسی شاعری کیا خاک کامیاب ہو سکتی ہے جس سے خلاقانہ تسکین معدوم ہو اور جس میں حقائق کی ترجمانی کے بجائے فرسودہ بدیسی تحریکات کو ہندوستان میں منتقل کر کے ان کی مبالغہ آمیز اور سفیہانہ نقالی کی گئی ہو۔ وہ بھی محض الفاظ میں۔ میدان عمل میں ان کے دشمن نکلیں۔ یہ ایسی شاعری ہے جو کسی خاص مقصد کی تکمیل اور اظہار کے لیے وجود میں آئی نہیں بلکہ لائی گئی ہے۔ اس کے اچھالنے والے چند گمراہ کردہ مدعا، برخود غلط نوجوان ہیں اور بس!"

خواجہ محمد شفیع دہلوی کے ارشادات ملاحظہ فرمایئے۔

"بات یہ ہے کہ ہر دور میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن میں منظر عام پر آنے کی ہوس تو ہوتی ہے مگر صلاحیت نہیں، نہیں وہ نئے نئے روپ دھار کر حلیہ بگاڑ کر سامنے آتے ہیں کہ شاید اسی عجوبے نظروں میں

مرغوب حسن خاں

غزل

میرے لیے اب زیست کی ہر شرط کڑی ہے
ناکردہ گناہوں کی سزا مجھ کو ملی ہے

اب اہل جہاں کوئی نئی بات سنائیں
روداد غم زیست تو ہر روز سنی ہے

اے ہم سفرو! آؤ نیا راستہ ڈھونڈیں
سنتے ہیں کہ یہ راہ بھی صحرا کو گئی ہے

رنگین نظاروں کو بھی گویائی تھی حاصل
ماضی کی کہانی یہ کتابوں میں پڑھی ہے

احساس کے ویرانے میں مدت سے پریشاں
خواہش مری تکمیل کا گھر ڈھونڈ رہی ہے

چڑھ جائیں۔ انھیں جان لینا چاہیے کہ اس طرح اہلِ نظر کی نظر پر نہیں چڑھ سکتے:۔

" ان بے تکی باتوں کا عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ قوم پر ایک بحرانی کیفیت طاری ہے اس حالت جذب میں جو منھ سے نکل گیا وہی اس دور کا ادب ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ حالت جذب دجنوں آپ جیسے چند لوگوں پر کیوں طاری ہوئی دوسرے بھی تو انھیں حالات میں لکھ رہے ہیں اور بامعنی لکھ رہے ہیں۔"

" لفظ شعر کا اطلاق کلام موزوں یا قافیہ پر ہوتا ہے۔ جناب جس حروف نویسی کو شعر کہہ رہے ہیں وہ اس تعریف میں نہیں آتی۔"

" بندہ نوازان کا قافیہ تنگ ہے۔ اسپ طبع لنگ ہے۔ ذوقِ سلیم دست زیرِ سنگ ہے۔ نظم کی قیود کے تحت اظہار و آلات پر قدرت نہیں۔ بحر میں رہ کر شناوری دکھا نہیں سکتے اس لئے سات سمندر کی بے بہرہ شاعری لائے ہیں اور اس کو قوم پر نازل کرنا چاہتے ہیں۔"

جناب ماہر القادری کے ملفوظات یہ ہیں:۔

" نئے ادب کے علمبردار تو کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ ان کی کثرت تعبیر نے اس خواب ہی کو پریشان کر دیا۔ ہاں میں ترقی پسند ادب کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ پریشان خیالی، انتشار ذہنی، بے ربطی اور مہمل گوئی کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کو پڑھ کر طبیعت کو وحشت ہونے لگتی ہے اور وہ لٹریچر جس میں انس نہ ہو، جاذبیت نہ ہو خواص وعوام کے کسی طبقے میں بھی مقبول نہیں ہو سکتا۔"

" بلینک ورس کی جتنی نظمیں اس وقت تک ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں سے ایک نظم بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے اردو ادب میں کوئی درجہ دیا جا سکے۔ بعض مصرعے یا ٹکڑے البتہ شگفتہ ہیں لیکن بلینک ورس کے دوسرے بے ربط اور بے ڈھنگے اجزا سے مل کر یہ شگفتگی بھی مذاق بن کر رہ گئی ہے بلینک ورس میں ذہن انسانی کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور شعر کی صحیح تعریف یہ ہے کہ سامع کا ذہن شعر سن کر اثر قبول کرے بلینک ورس میں آہنگ، ترنم اور تناسب کا فقدان ہے اور شعر انھیں حسین اجزا سے ترکیب پاتا ہے۔ بلینک ورس شاعری کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ مذاق اگر مذاق سمجھ کر کیا جائے تو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن جب مذاق کو فکر و سنجیدگی سے تعبیر کیا جائے تو یہ دعویٰ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ بلینک ورس اردو شاعری میں ایک تجربہ ہے۔ ہمیں تجربہ کے نتیجے کا انتظار کرنا چاہئے، ابھی شور مچانے اور واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ بعض تجربے ایسے بھی ہیں جن کی خطرناکی اور مضرت ابتدا ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے تجربوں کا ابتدا ہی میں گلا گھونٹ دینا چاہیے۔ تاکہ آگے چل کر مضرت اور خرابی کی اشاعت نہ ہو سکے۔ بُرائی اور غلطی کو ڈھیل دینا عقلمندی کی بات نہیں۔ ہر جگہ رواداری اور تحمل کا استعمال اچھا نہیں ہوتا۔

ایک ناموزوں آج آسانی کے ساتھ بلینک ورس کہہ سکتا ہے۔ اس طرح بلینک ورس کے حامی ناموزوں طبع اشخاص کو شاعروں کی صف میں لانا چاہتے ہیں اور وہ جن کو شعر گوئی کی صلاحیت ہی قدرت سے ودیعت نہ کی گئی ہو خود کو شاعر سمجھ کر اپنے غیر شاعرانہ افکار سے جو ظلم ڈھائیں گے اس کے نتائج کی المناکی سے میرا تو دل کانپا جاتا ہے۔"

" ہمارے یہ انگریزی پڑھے ہوئے آزاد خیال شعراء جو ہر آن انقلاب کے نعرے لگاتے ہیں مغرب سے ذہنی طور پر اس قدر مرعوب ہیں کہ بلینک ورس کو جو اردو شاعری کے مزاج کے مخالف ہے اردو شاعری پر زبردستی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ بلینک ورس غلامانہ ذہنیت کی نشانی ہے اور قیامت تو یہ ہے کہ اس مرعوبیت، غلامی اور محکومیت کو جدت اور آزاد خیالی کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔"

" نیا ادب زبان وادب میں بدنما جدتوں کا اضافہ کر کے اردو کو تباہ کر رہا ہے اور اگر اس بے راہ روی کا سدِ باب نہ کیا گیا تو اردو زبان ایک ٹوٹا ہوا ساز بن کر رہ جائے گی اور اس میں کوئی کشش باقی نہ رہ گی۔"

پروفیسر حامد حسن قادری کے مضمون کے بعض اقتباسات دیکھئے:۔

" اگر ایک طرف پھیکی شاعری ہے تو ایک قسم مبہم شاعری کی بھی انقلاب پسندوں نے شروع کر دی ہے یعنی ساری نظم پڑھنے کے بعد کوئی مدعا و مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ مرف مرکزی خیال اور اصل مضمون تو مل جاتا ہے لیکن خیالات کی کڑیاں مربوط نہیں ہوتیں۔ کنایہ و ابہام میں مطلب ادا کیا جاتا ہے مثلاً ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی نظم "سرخ ہونٹ" کو دیکھئے (پوری نظم نقل کی ہے) اس نظم میں تشبیہ، ترکیب

• علقمہ کی خامی سے قطع نظر پورا مضمون مبہم و غیر واضح ہے:

"ایک مبہم شاعری اور دیکھ لیجئے، فیض احمد فیض کی نظم "تنہائی" ہے، یہ تنہائی کا تصور ہے لیکن صاف و مسلسل نہیں، اگرچہ ن۔ م راشد اس نظم کو حسین اور انتہا درجہ کی اثر آفریں نظم قرار دیتے ہیں۔"

"جن نظموں کو میں نے مبہم کہا ہے ان کا انداز یہ ہے کہ شاعر ایک مضمون سوچتا ہے اور اس کو صاف و حسین الفاظ میں لکھنے کے بجائے استعارہ و کنایہ میں بیان کرتا ہے۔ اس کے لیے اصطلاحیں تجویز کرتا ہے نشانات و علامات مقرر کرتا ہے اور یہ سب کچھ شاعر کے ذہن میں ہوتا ہے، بادی النظر میں اور ظاہر الفاظ سے نظم کا کچھ اور مطلب ہوتا ہے اور شاعر کا مقصود کچھ اور یہ پیرایہ و اسلوب فی نفسہ درست ہے نہ صرف درست بلکہ بلیغ تر اور کچھ جدید شاعری کی ایجاد بھی نہیں ہے، ہر زبان و ملک کی شاعری میں موجود ہے لیکن وہاں وہ علامات و اصطلاحات مقرر ہوتی ہیں۔ ہر شخص ان کے ظاہر و مخفی معنی سمجھ لیتا ہے، نئی نظموں میں اصل مقصود بطن شاعر میں رہتا ہے اسی لیے ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔"

"اسی سے ملتا جلتا ایک اور اسلوب بھی نئی تخئیل کی بدولت وجود میں آیا ہے اس پر کبھی مفصل لکھنے کا ارادہ ہے یہ پیرایہ غزل جدید میں پیش کیا گیا ہے مثلاً اس شعر کو پڑھئے۔

دم لے رہی تھیں حسن کی جب سحر کاریاں
ان وقفہ ہائے کفر کو ایمان بنا دیا
(فراق گورکھپوری)

اور اس کا مطلب سوچئے، شاعر کیا کہتا ہے؟ حسن کی سحر کاریوں کا دم لینا کیا؟ اور دم لینے کے لمحے وقفہ ہائے کفر کیوں اور ان وقفوں کو ایمان بنا دینا کیا؟ سوچ لینے کے بعد خود شاعر کی مندرجہ ذیل تشریح پڑھئے (فراق صاحب کے ایک مضمون سے اقتباس)۔

اب اسی شعر کو پڑھئے۔ کیا بانکا شعر معلوم ہوتا ہے لیکن کیا یہ بانکپن تشریح معلوم ہونے سے پہلے بھی ان الفاظ میں تھا؟ یہی میرے نزدیک ابہام ہے۔"

"مقصود یہ ہے کہ کلام میں ابلاغ (کمیونیکیشن) سب سے ضروری چیز ہے، بات ایسے الفاظ اور پیرایے میں کہی جائے کہ سننے والا سمجھ سکے۔"

حامد حسن قادری مرحوم نے فراق کے متعدد شعروں پر عمل جراحی کر کے بتایا ہے کہ ان میں ابہام ہے اور ان کا ابلاغ خاطر خواہ نہیں ہو سکا ہے۔ قادری صاحب کے اس مضمون کے مطالعے کے دوران میں مجھے فراق صاحب کا وہ فقرہ یاد آیا جو انھوں نے پچھلی ملاقات میں کہا تھا کہ "بھائی نئے شاعروں کے یہاں ابلاغ و ترسیل نہیں ملتی اور سنا ہے وہ اس کے قائل بھی نہیں، پھر اپنا کلام رسالوں میں کیوں چھپواتے ہیں۔"

مگر قادری صاحب نے فراق صاحب کے شعروں میں عدم ابلاغ و ترسیل کو ثابت کرنے کے بعد یہ سطریں بھی لکھی ہیں۔

"پروفیسر فراق صاحب نے رموز و اشارات سے کام لیا ہے لیکن جن حقائق و نظریات کو بیان کیا ہے وہ خود ابھی ہندوستان اور اردو زبان کے ارباب شعر و ادب میں شائع و معروف نہیں۔ عوام کا کیا ذکر ہے خواص میں بھی بہت سے ان مسائل کو نہیں جانتے اور جو واقف ہیں ان کے ذہن میں بھی ہر وقت یہ چیزیں اس طرح حاضر نہیں رہتیں کہ شعر پڑھتے وقت ان کی طرف انتقال ذہن ہو سکے اس لیے فراق صاحب کے یہ اشعار قبل از وقت ہیں، عصر حاضر اور نسل موجود کے لیے نہیں ہیں لیکن یہ اشعار شاعر کے کلیات میں ثبت و محفوظ رہنے چاہئیں، جو ہستیاں ابھی منتظر تخلیق ہیں ان کے وجود میں آنے تک ممکن ہے یہ طرز و اسلوب اور یہ علوم و حقائق روزمرہ کی باتیں ہو جائیں اور شعر و ادب میں رمز و کنایہ کی دلالت ان مسائل کی طرف واضح اور صریح ہو جائے۔"

قادری صاحب کے ان خیالات کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ اس زمانے کے بزرگوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو نئی شاعری کے ابہام پر معترض ہونے کے باوجود اس بات کی گنجائش رکھتے تھے کہ طرز و انداز و اسالیب کی یہ تبدیلیاں اگر آج نہیں تو کل ہمارے لیے گوارا ہو جائیں گی اور آنے والی نسلیں ان کے اندر چھپے ہوئے امکانات سے فائدہ اٹھائیں گی اس لیے وہ اس بات کے حق میں تھے کہ اس طرح کے کلام کو ثبت و محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ مگر جب فراق صاحب جیسے جدید غزل گو اور مجتہدانہ اسلوب کے مالک کسی لمحے میں یہ سوچنے لگتے ہیں کہ نئے شاعر اپنی مبہم شاعری کو چھپواتے کیوں ہیں جب کہ وہ دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتی تو بڑی حیرت ہوتی ہے اس لئے کہ اس قسم کی باتیں تو خود فراق صاحب کی اٹھان کے زمانے میں ماہر القادری اور خواجہ محمد شفیع جیسے حضرات کی زبان سے سننے میں آتی تھیں جو بے چارے ایک طرح سے معذور تھے۔ ہم تو فراق صاحب کو حامد حسن قادری صاحب سے بھی آگے دیکھنے کے متمنی ہیں اس لئے کہ نئی شاعری میں بہت سے ایسے عناصر شامل ہیں جو خود فراق صاحب کی اپنی گاڑھی کمائی ہے (باقی صفحہ ۱۲ پر)

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

انیس انور

مکتوب لندن

آپ کی مجلس

بی بی سی، ریڈیو شیفیلڈ کی ہوم سروس میں پندرہ منٹ کے اردو پروگرام کا نام "آپ کی مجلس" تجویز کیا گیا ہے۔ یہ پروگرام ہر ہفتہ کی شام سوا چھے بجے سے ساڑھے چھ بجے تک نشر ہوا کرے گا۔ اس سلسلہ میں تاریخ کا اعلان جلدی کر دیا جائے گا۔ پروگرام وی۔ ایچ۔ ایف۔ لائن پر ہی سنا جا سکے گا۔ یہ پروگرام خبروں، موسیقی اور مقامی فیچرز پر مشتمل ہوگا۔ شیفیلڈ کے کمیونٹی ریلیشنز افسر مسٹر آل رسول اور اسسٹنٹ کمیونٹی ریلیشنز افسر مسز بٹ اس پروگرام کو ترتیب دیا کریں گے۔

عید مبارک۔ بی بی سی، ٹیلیویژن

گزشتہ ہفتہ بی بی سی ٹیلیویژن کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک ایسا واقعہ ہوا جو قابل مبارکباد ہے اور امید ہے یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ اتوار کی صبح بی بی سی ریڈیو پر "اپنا ہی گھر سمجھئے" میں عید کا ذکر اس طرح آیا کہ سلیم شاہد نے سامعین کو عید مبارک پیش کی۔ توقع تو یہ تھی کہ پروگرام کو مناسب حصہ عید کے موضوع پر مشتمل ہوگا مگر بات مبارکباد پر ختم ہوگئی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ پروگرام اگر کسی مذہبی تہوار کے دن پیش کیا جا رہا ہو تو اس میں اس تہوار پر کوئی خاص چیز پیش کی جائے۔ امید ہے خداوندان بی بی سی اب اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوں گے اور دیگر مذہبی تقریبات کا بھی خیال رکھیں گے۔

اخبارات کی قیمتوں میں اضافہ

برطانیہ کے تقریباً تمام روزناموں نے اپنی قیمتوں میں ۲۵ فی صدی کا اضافہ کر دیا ہے۔ برطانوی جریدہ پرنٹنگ ٹریڈ جرنل نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں برطانوی اخبارات کی طباعت اور اضافۂ قیمت کے مسائل پر ایک مضمون میں ہفت روزہ مشرق کے لیے ایک کیا ہے۔ اخبار کی رائے میں لاکسٹن پبلشرز ان بہت کم اشاعتی اداروں میں سے ایک ہے جس نے "مشرق" کے لیے ایک نئی اور بہتر پرنٹنگ مشین "روٹاگراویر" استعمال کرنے میں پہل کی ہے۔ اخبار مزید رقمطراز ہے کہ:

"طباعت کی ان جدید سہولتوں کے سبب برطانیہ میں مقیم بھارتی و پاکستانی تارکین وطن کا مقبول ترین اخبار "مشرق" اور بھی دلکش اور معیاری ہوگیا ہے اور اس کی صوری و معنوی خوبیوں میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ پونڈ کی قیمت گرنے سے طباعت کے اخراجات میں زبردست اضافہ کے پیش نظر اب "مشرق" کی قیمت بجائے ایک شلنگ کے ایک شلنگ چار پنس ہوگئی ہے۔" تاہم تحریک "آفاق" (قیمت ۹ شلنگ) اور "ایشیا" (قیمت ایک شلنگ) کی قیمتوں میں اضافہ کا اعلان نہیں ہوا۔

میں اردو سیکھنے کے لیے کراچی گئی تھی۔ برطانوی اداکارہ

یوں تو میں دنیا کی ہر زبان سیکھنے کی آرزو رکھتی ہوں کیونکہ میں دنیا کی ہر قوم اور ہر نسل کے لوگوں کو پسند کرتی ہوں، میرے نزدیک رنگ اور نسل میں کوئی تفریق نہیں لیکن اردو سے مجھے خاص طور پر انس ہے۔ میں یہ زبان کراچی سے سیکھ کر آتی ہوں۔

"جہاں یہی ہے فیصلہ دل کا" فلم بنانے والوں نے مجھے برطانیہ سے محض اس لیے بھیجا تھا کہ میں یہ زبان سیکھ آؤں میں نے وہاں کی تہذیب کو بڑے قریب سے دیکھا اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔"

مراسلات

اُردو بھون

اردو کی مٹھاس اور شیرینی کے شیدائیوں کو جناب مسعود حسن صاحب سے ضرور اتفاق ہے لیکن اب جب کہ کمیٹی نے "اردو گھر" کے لیے تصفیہ کر دیا ہے. تو سابقہ بحث اور تکرار کو تازہ کرنا مناسب نہیں. حیدر آباد نے اپنی عمارت کا نام اردو ہال (HALL) رکھا اور وہ مقبولِ عام ہوا دلی اگر اردو سنٹر (CENTRE) نام رکھتا تو غیر اردو داں بھی سمجھ جاتے کہ کیا عمارت ہے۔

(سجاد مرزا)

ہماری زبان میں حصۂ نظم

۲۲ مارچ کے "ہماری زبان" میں جناب میر عرفانی صاحب کا مراسلہ دیکھا مراسلہ نگار کا شکوہ بجا ہے کہ اس پرچے میں حصۂ نظم کی کمی اکثر اہل ذوق کو گراں گزر رہی ہے. موصوف نے جو سوالات قائم کئے ہیں ہر صاحب ذوق کے نزدیک ان کا جواب نفی ہی میں ہو سکتا ہے۔

حصۂ نظم نثر سے کم اہمیت نہیں رکھتا ہے، نہ کوئی اہلِ ذوق حصۂ نظم کی افادیت سے منحرف ہو سکتا ہے اور نہ حصۂ نظم ناظرین ہماری زبان کی طبع نازک پر گراں گزرتا ہے. اس لئے کہ اس کے پڑھنے والوں میں اکثریت شعراء اور ادباء ہی کی ہے اور شعر و سخن ان دونوں طبقوں کے لیے غذائے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں عرفانی صاحب کے خیالات سے پورے طور پر متفق ہوں اور یہ رائے رکھتا ہوں کہ "ہماری زبان" میں حصۂ نظم کے لئے کم از کم ایک ورق ضرور مخصوص ہونا چاہیے. اس لیے کہ یہ اس زبان کا ترجمان ہے جو شعر و نغمہ کی زبان ہے اور گلستان غزل کی جان ہے۔

امید ہے کہ دوسرے شعرائے کرام اور ادبائے محترم میرے خیال کی تائید فرمائیں گے۔

(حافظ دعا میں پوری)

(۲)

ہماری زبان ۲۲ مارچ ۷۸ء کے شمارے میں کسی صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا جس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حصۂ نظم کو وسعت دی جائے یا اس سلسلہ کو یکسر ختم کر دیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہماری زبان میں حصۂ نظم کو مناسب جگہ ملی ہوئی ہے. اس پر تشنگی کا گلہ جائز نہیں. کیونکہ اس جذبہ کی تسکین کے لیے بہت سے پرچے پڑے ہوئے ہیں. حصۂ نظم کی جگہ میں کمی کر کے ادارہ ہماری زبان نے ادب نوازوں پر احسان عظیم کیا. اس کے لیے ان کا احسان مند ہونا چاہیے نہ کہ معترض. کیا اس طرح ادب نوازوں کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم نہیں ہوتے و نایاب مواد حاصل نہیں ہوتے ان انمول اشیاء کی جگہ شعر و شاعری قابض ہو جائے گی تا رئین ہماری زبان اس بات کو پسند کریں گے؟ ہماری زبان کے صفحات کا ایک ایک انچ قیمتی ہے جس کی حفاظت لازمی ہے. میں تو اتنا کہوں گا کہ حصۂ نظم کو ہماری زبان سے ختم ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

ہماری زبان کے قیمتی صفحات کیا اس لیے ہیں کہ انھیں شعر و شاعری کی نذر کر دیا جائے؟ اگر نہیں تو پھر نثر اور نظم کی بحث ہی کیا؟ سینکڑوں غیر معیاری کلام سے ایک معیاری کلام شائع کرنا بہتر ہے۔

ہماری زبان کے صفحات جس طرح علم داں طبقہ کو مستفید کرتے ہیں کیا اس کا نعم البدل کہیں اور ملتا ہے؟ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ اس کا موازنہ دوسروں سے کیا جائے. ایک علمی اور تفریحی جریدہ میں فرق ہوتا ہے اور اسی فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے معترض کو اعتراض بھی کرنا چاہیے۔

(ایم. اے. لطیف گلشن)

مرزا غلام علی عشرت بریلوی

مرزا غلام علی عشرت بریلوی (المتوفی ۱۲۳۶ ہجری وابستہ دربار رامپور) کی حیات اور ان کے کارناموں خصوصاً ان کی نثری داستان "داستان سحر البیان" پر میں تحقیق کر رہا ہوں. اس سلسلے میں واقف کار حضرات مندرجہ ذیل امور سے مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

(۱) کیا "داستان سحر البیان" کے تین نسخوں (رضا لائبریری رامپور، خدا بخش خاں لائبریری، پٹنہ اور پروفیسر ذکی الحق صاحب) کے علاوہ کوئی اور نسخہ کہیں ہے۔

(۲) "دیوان عشرت"، مثنوی ریاض العین اور پدماوت" کے علاوہ ان کی شعری و نثری تصنیفات اور کون کون سی ہیں؟

(۳) کوئی صاحب ان کے خاندان سے اگر تعلق رکھتے ہوں تو مہربانی فرما کر مجھے آگاہ کریں۔

(۴) کسی ایسی تصنیف کی نشان دہی کی جائے جس میں رامپور اور نوابان رامپور کی سیاسی، تاریخی، ادبی اور معاشرتی زندگی کی تفصیل ہو اور خصوصیت سے دبستان رامپور کی وضاحت کی گئی ہو

(احمد سجاد کوارٹر نمبر ۲۱۷ E (ع) بریاتو ہاؤسنگ کالونی رانچی)

اردو کی کہانی شعراء کی زبانی

میں اس نام سے اردو زبان و ادب پر لکھی گئی نظموں کو مرتب کر رہا ہوں جس کا دیباچہ اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" بمبئی لکھ رہے ہیں اور جو مسرت بک ڈپو پٹنہ ۴ سے شائع ہو رہی ہے. شعراء حضرات اپنی نظمیں اور مختصر سوانح جلد از جلد ارسال فرما کر ممنون کریں۔

(مناظر عاشق ہرگانوی. ہرگانواں بر گجہ مونگیر (بہار))

انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کی جشن غالب کمیٹی

بھوپال اور مدھیہ پردیش کے دوسرے شہروں میں اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات منانے کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ صوبائی انجمن ترقی اردو کے صدر جناب فخر الدین اور جنرل سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے انجمن کی تمام شاخوں اور اردو دوستوں کے نام ایک مشترکہ اپیل میں "ہماری زبان" کے ۵ اپریل کے شمارہ کے حوالے سے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہم اس زبان کی بقا اور ترقی کے لیے زیادہ کوشش کریں جس نے غالب جیسا شاعر پیدا کیا۔ اپیل میں مزید کہا گیا ہے کہ سارے اردو دوستوں کو مل جل کر پروگرام ترتیب دینا چاہیے۔ شہر بھوپال کی انجمن ترقی اردو کے ممبران مجلس عاملہ اور ممبران کونسل کے مشترکہ جلسہ میں جو حال ہی میں منعقد ہوا تھا، غالب کی برسی کے سلسلے میں راجہ حامد علی کے شایان شان تقریبات منانا طے کیا ہے۔ اس جلسہ نے جناب ایم عرفان صدر شہری انجمن کی سرپرستی میں ایک کمیٹی بھی پروگرام کی روپ ریکھا تیار کرنے کے لیے تشکیل دی ہے پروفیسر حسن مسعود اس کے کنوینر ہیں۔

(حنات صدیقی آفس سکریٹری مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو)

جشن غالب کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو ہند شاخ

بنیا پوکھر کلکتہ کا جلسہ

انجمن ترقی اردو ہند شاخ بنیا پوکھر کی مجلس عاملہ کی ایک نشست ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء اتوار کو منعقد ہوئی جس میں ایک سب کمیٹی کی تشکیل اس مقصد کے ماتحت کی گئی کہ وہ غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ایک موزوں و مناسب اسکیم مرتب کرے۔

(ادریس انور جنرل سکریٹری)

دائرہ اردو گیا کی ادبی نشست

دائرہ اردو کی بارہویں ماہانہ نشست ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء کو سات بجے شام سید علی مظفر نواب کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر باسودیو نندن صدر شعبۂ ہندی گیا کالج گیا نے "ہندی ادب میں ظرافت نگاری" پر اظہار خیال کیا۔

ظرافت نگاری کی مقبولیت کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر باسودیو نندن نے بتایا کہ ہندی کی ابتدائی ظرافت نگاری زبردستی کی ہنسی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں ظرافت اپنے صحیح اور اصلی رنگ میں ابھرتی ہے۔ سماجی مسئلوں کی کمزوریوں پر ظرافت اور طنز کے تیر چلنے شروع ہو گئے بیڈھب بنارسی اور کاکا ہاتھرسی ہندی شاعری کے نامی ظرافت نگار شاعر ہیں۔ اکبر الہ آبادی کا رنگ ہندی شاعری میں بہت مقبول رہا ہے۔ اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر باسودیو نے بتایا کہ تھیں، اور اعلیٰ ظرافت کے نمونے اب تک ہندی ادب میں

گئی ہیں۔ نو بجے پروفیسر انتخاب ظفر کے اظہار تشکر کے بعد نشست برخاست ہوئی۔

(م۔م۔ عالم سکریٹری نشر و اشاعت)

سہ لسانی فارمولے میں اردو کو شامل کیا جائے

حیدرآباد، ریاستی اسمبلی میں لسانی قرارداد کی منظوری سے اردو کے لیے جو تشویش ناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس پر غور کرنے اور سہ لسانی فارمولے میں اردو کو شامل کرنے کے لیے از سر نو جد و جہد شروع کرنے کی خاطر اردو کی مختلف تنظیموں اور سیاسی جماعتوں کے نمائندوں، اراکین اسمبلی اور ممتاز شہریوں کا ایک جلسہ ۲۴ مارچ کو اردو ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت نواب میر احمد علی خاں صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے کی۔ طے کیا گیا کہ حکومت کو اردو والوں کے جذبات سے باخبر اور ان کے مطالبات سے واقف کرانے کے لیے ایک بڑا جلسۂ عام منعقد کیا جائے جس میں شرکت کے لیے چیف منسٹر، وزیر سرکاری زبان اور وزیر قانون کو دعوت دی جائے اور اس موقع پر ایک میمورنڈم پیش کیا جائے۔

میمورنڈم کا مسودہ قبل از قبل گشت کر دیا گیا تھا جس میں پروفیسر ہارون خاں شروانی، نواب میر احمد علی خاں، ولد الرحمین، پروفیسر رشید الدین خاں وغیرہ نے تحریری ترمیمات روانہ کیں جن میں سے اکثر کو بحث و مباحثے کے بعد میمورنڈم میں شریک کر لیا گیا۔ میمورنڈم میں ملک کی لسانی صورت حال کا جائزہ لیتے اور اسمبلی میں قرارداد کی منظوری سے پیدا ہونے والی صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد اردو والوں کی مایوسی اور بے چینی کا ذکر کیا گیا ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو مادری زبان والے بچوں کو اپنی مکمل تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کرنے کا موقع حاصل رہے۔ دوسری زبان کی حیثیت سے تلگو لازمی طور پر پڑھائی جائے، جو ان کے لیے انگریزی اور ہندی سے زیادہ ناگزیر ہے۔ تیسری زبان کی حیثیت سے انگریزی یا ہندی میں سے کوئی ایک زبان پڑھنے کا انھیں اختیار ہونا چاہیے۔

عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ یہی ایک فارمولا اردو والوں کے حقوق کی ضمانت دے سکتا ہے اور ان کی بے چینی اور بے اطمینانی کو دور کر سکتا ہے اس لیے حکومت کا فرض ہے کہ وہ اسے قبول اور رائج کرتے ہیں تذبذب یا کسی ذہنی تحفظات سے کام نہ لے ورنہ ملک کے لسانی بحران میں اضافہ ہوگا اور لسانی اقلیتیں اپنی زبان اور تہذیب کے مستقبل سے مایوس ہو جائیں گی۔ اس جلسہ میں شرکت کرنے والوں میں پروفیسر ہارون خاں شروانی، پروفیسر حبیب الرحمٰن، عابد علی خاں عابد، سرینواس لاہوٹی، ڈاکٹر حسینی شاہد (انجمن ترقی اردو) ایس۔ راجیشور راؤ ایم۔ ایل۔ اے (کمیونسٹ پارٹی)، خلیل اللہ حسینی (تعمیر ملت)، سلطان صلاح الدین اویسی، ایم۔ ایل۔ اے (مجلس)، رائے جانکی پرشاد (اردو مجلس)، چندر سری واستوا، میر سر سردار علی خاں (انجمن تحفظ اردو)، گروناتھ سکسینہ، ڈاکٹر اختر احمد، ناصر کرنولی، ایڈیٹر ماہنامہ پیام، غلام یزدانی ایڈووکیٹ قابل ذکر ہیں۔

(ترقی اردو)

تبصرے

وحید اختر

اختر انصاری کی دو کتابیں

پرچھائیں (قطعات)	مطالعہ و تنقید
قیمت: تین روپے	قیمت چار روپے پچاس پیسے
ناشر: فرینڈز بک ہاؤس، علی گڑھ	ناشر: فرینڈز بک ہاؤس، علی گڑھ

اختر انصاری ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جو لگ بھگ چالیس برس سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں ان کی ادبی زندگی کا آغاز رومانی دور کے افسانہ نگاروں اور شاعروں کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی ابتدا سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ رومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ اپنے زمانے کے مقبول اور کامیاب افسانہ نگار سمجھے جاتے تھے تنقید میں ان کی انفرادیت نے "افادی ادب" اور "ایک ادبی ڈائری" کی صورت میں اپنا اظہار کیا۔ شاعری میں انھوں نے نظم اور غزل کے ساتھ قطعات پر بھی توجہ کی اور قطعہ کو اس کی موجودہ شکل اور اسلوب میں روشناس کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمات کے استاد کی حیثیت سے انھوں نے اردو کی تدریس کے مسائل کی تفہیم و تشریح میں بھی قابل قدر کام کیا ہے اس ضمن میں ان کی اور تصنیفات کے علاوہ "غزل اور درس غزل" کا نام لیا جا سکتا ہے ہمارے یہاں عام طور پر لکھنے والوں کے تخلیقی سرچشمے اتنے کم مایہ ہوتے ہیں کہ جب تک جذبات میں اُبال رہے تحریر کا سلسلہ باقی رہتا ہے اور پھر قلم کی روشنائی مدھم ہوتے ہوتے خشک ہو جاتی ہے۔ بہت سے شاعر و ادیب جنھوں نے اختر انصاری کے بعد لکھنا شروع کیا، برسوں قبل اساتذۂ متقدمین کی صف میں شامل ہو کر محض تبرک بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن اختر انصاری کا ذہن اور قلم اب بھی رواں ہے اسی سے ان کے علمی و ادبی انہماک، سنجیدگی، خلوص اور ذہنی زرخیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ادب صحیح معنوں میں ان کا اوڑھنا بچھونا ہے زیر تبصرہ کتابوں کے علاوہ حال ہی میں ان کی ایک مثنوی "درد داغ" اور نظموں کا ایک مختصر مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ اختر انصاری بھی اپنے بیشتر معاصرین کی طرح جدید ادب و شاعری سے اپنے آپ کو ذہنی طور پر ہم آہنگ نہیں کر پائے لیکن دوسروں کی طرح ان کے یہاں یہ کیفیت ذہن کے منجمد ہونے سے پیدا نہیں ہوئی، بلکہ ادب کے اس مخصوص تصور کا نتیجہ ہے جو ادب کے بدلتے ہوئے معیاروں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ ایک طویل عمر کے بعد ہمیں پرانے لکھنے والوں سے یہ توقع بھی نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ہر نئی تبدیلی کا خوشی سے خیر مقدم کریں گے۔ جس ادیب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تخلیق کا وشوں میں صرف کیا ہے اور جس کا ایک مخصوص رویّہ بن چکا ہو اسے اس کے اپنے معیاروں اور رویوں ہی کی روشنی میں سمجھا اور پرکھنا چاہیے۔

اختر انصاری کی شاعری اور تنقید، دونوں ہی کا سلسلہ رومانیت اور ترقی پسندی کے ادبی تصورات سے ملتا ہے تنقید میں ان کے یہاں یہ تصورات زیادہ واضح طور پر نمایاں ہیں لیکن شاعری میں ان میلانات کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے کرب، بے یقینی، بیزاری اور ایک حد تک شکست نے بھی ان کی آواز میں اپنے اظہار کے امکانات ڈھونڈ لیے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری آج کی شاعری سے مزاج اور موضوعات کے لحاظ سے نسبتاً زیادہ قریب ہے۔

پرچھائیں میں ۱۹۲۸ء سے ۱۹۵۸ء تک کے بہترین قطعات کو یکجا کر دیا گیا ہے یہ ان کے منتخب قطعات کا مجموعہ ہے۔ گزشتہ تیس سال میں اس نئی صنف کو مقبول کرنے میں اختر انصاری نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ قطعات کے موجودہ فارم (چار مصرعوں) کے امکانات کو اجاگر کرنے میں ان کے بعد صرف احمد ندیم قاسمی ہی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن جس طرح اختر انصاری آج تک اس صنف کے جدید سے جدید تر امکانات کو برت رہے ہیں۔ اس کی مثال اور کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ حال ہی میں اختر انصاری نے زریں کمار شاد کے قطعات پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے (گفتگو ۔۔۔) ان کی بنا پر یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ شاید اختر انصاری اور شاد کے قطعات میں کوئی معنوی اور ذہنی ربط بھی ہوگا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے شاد بنیادی طور پر عدم کے قبیلے کے شاعر ہیں اس کے برخلاف اختر انصاری کی شاعری میں زندگی کا گہرا تجربہ اور اس سے پیدا ہونے والا ارتقائی تفکر ملتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ذریعہ اظہار کے مشترک ہونے سے خود اختر انصاری بھی دھوکا کھا گئے ہیں۔ کم سے کم میں تو ان دونوں شاعروں کا نام ایک سانس میں لینا سخن فہمی کی شریعت اور آئین کے لحاظ سے کفر سمجھتا ہوں۔ دونوں کی سطح میں زمین و آسمان کا فرق ہے اختر انصاری نے داخلی قطعہ کو وہ لہجہ اور آہنگ دیا ہے عصر حاضر کی پیچیدہ کیفیات جس کی متقاضی تھیں اسی لیے نظریے کی سطح پر جدید شاعری سے تعصب کی حد تک اختلاف رکھنے کے باوجود تخلیق کی سطح پر وہ آج کی شاعری سے بہت قریب ہیں۔

اختر انصاری کے ابتدائی دور کے قطعات موضوع کے انتخاب اور ذہنی رویے کے لحاظ سے بھی رومانی ہیں اور لہجہ و طرزِ ادا کے لحاظ سے بھی۔ رومانیت کا یہ رجحان ترقی پسند دور کے قطعات میں بھی نمایاں رہا ہے اسی لیے ان کے یہاں وہ موضوعات و مسائل تو نہیں آتے جو بہت واضح طور پر ترقی پسند کہلائے جا سکیں اور جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۰ء تک ہماری شاعری کے غالب موضوعات تھے۔ ان قطعات کا موضوع فطرت کے حسین مظاہر اور زندگی کے وہ تجربات و واردات ہیں جن کا تعلق رومانیت اور داخلیت کے ساتھ گہرا ہے۔ شعر کے سلسلے میں بھی ان کا رویّہ جوش کے نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے

شعر یوں کہنے کو کہتے ہیں لیکن اختر سچ یہ ہے
دل کے محسوسات کو لفظوں میں بھر سکتے نہیں

لیکن ان کے لہجے میں انقلاب کی وہ گھن گرج نہیں جو جوش اور

دور کے دوسرے رومانی شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ اس کے برخلاف ان کے یہاں تصورِ محبوبی کی خوشگوار کیفیت، خود کلامی، دردمندی اور تفکر کی دھیمی دھیمی آنچ ملتی ہے۔ بعد کے دور کے قطعات میں رومانیت سے ان کا رشتہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ اس دور میں ان کے ادب کو بڑی حد تک مخالف رومانیت (ANTI-ROMANTICISM) رجحان کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اب رومانی تصورات کی دھند چھٹ گئی ہے اور زندگی اپنی اصلی شکل میں، چاہے وہ کتنی ہی کھردری اور بھیانک ہے عریاں نظر آنے لگی ہے۔ رومانی آدرشوں کی شکست میں کا اظہار وہ پورے کرب سے کرتے ہیں۔ ان کی رومانیت ہی کی ایک نئی شکل ہے اور اسی مقام پر وہ جدید شاعری اور جدید شاعروں کی حقیقت پسندی اور کرب و افسردگی کی سطح کو چھو لیتے ہیں۔ بعد کے قطعات میں زندگی زیادہ سنجیدہ، گمبھیر اور بڑی حقیقت بن کر سامنے آتی ہے۔ زندگی کی نا ہمواری اور محرومیوں نے کہیں کہیں قنوطیت کی شکل بھی اختیار کرلی ہے۔ لیکن میں اس بات کو اس لئے ناگزیر سمجھتا ہوں کہ آج ہر اس شخص کا مقدر ہے جو اپنے ذہن میں زندگی کا کوئی اونچا تصور رکھتا ہے اور عملی زندگی میں ہر قدم پر ہونے والی بھونڈی بازی، بدمعاشی اور ریاکاری سے نباہ نہیں کرسکتا۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اختر انصاری جبر کے فلسفے کو تسلیم کرتے ہیں اور ارادہ و اختیار کی تہی دستی کے قائل ہیں۔ لیکن دراصل ان کی جبریت بھی زندگی اور موجودہ معاشرے پر گہرا طنز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس قنوطیت و جبریت کو ہم ان کے مزاج کا حصہ سمجھنے کے بجائے ان کے طنزیہ لہجے کے مظاہر سمجھنا چاہئے، کیونکہ زندگی پر طنز کرنے کے باوجود زندگی سے ان کی بے پایاں محبت، چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ان کا تلذذ اور ان کی معصوم نشاط کوشی جو خضرِ ادبیت پسندی بھی بن جاتی ہے۔ زندگی اور انسان پر ان کے غیر متزلزل ایمان ہی کا اظہار کرتی ہے۔ ان موضوعات و مسائل پر ان کے تاثرات کا انتخاب کرنا اور مثالیں پیش کرنا اس لیے مشکل ہے کہ آخری دور کے سب ہی قطعات اپنی جگہ منتخب، منفرد اور ممتاز ہیں۔

پچھلے چند برسوں میں اختر انصاری نے قطعات کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر رباعیات کی طرف توجہ کی ہے۔ فن پر انھیں جو خلاقانہ دسترس حاصل ہے، اس کے پیش نظر وہ رباعی میں بھی وقتے ہی کامیاب ہوسکتے ہیں۔ اس لئے یہ توقع کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی رباعیات کا مجموعہ قطعہ نگاری میں ان کی مشق اور انفرادیت کا اگلا قدم ہوگا۔

"مطالعہ و تنقید" اختر انصاری کے سولہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کی ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۵ء تک کی نثری نگارشات کا احاطہ کرتا ہے۔ "ادب اور سیاست" "اردو غزل" "جنگ، سیاست اور شاعری" "قدیم انسانی احساس فن اور اظہار" مسائلی مضامین ہیں۔ ان میں اور ان کے علاوہ دوسرے مضامین جیسے "مجاز کی شاعری" اور "اقبال کی شاعری کا آہنگ" میں ان کا نقطۂ نظر مقصدی اور افادی ہے۔ ان مضامین میں ان کا طرزِ فکر ترقی پسند ناقدین سے مختلف نہیں۔ یہ مضامین اس دور کی سیاسی نظریہ سازی ہی کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان مضامین میں جو سلامتیٔ فکر، توازن اور اعتدال ملتا ہے وہ اس دور میں اتنا عام نہیں تھا۔ بعض مضامین تحقیقی اور معلوماتی نوعیت کے ہیں جیسے مرزا فرحت اللہ بیگ، اردو ڈراما اور انار کلی، گوئٹے، ڈان کوئک زوٹ اور سانکو پنزا اور وہ تمام مضامین جو ناول اور افسانے سے متعلق ہیں۔ اختر انصاری کی نظر اردو ادب کے ساتھ عالمی ادب کی روایات پر بھی گہری ہے اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی معلومات اور ادبی بصیرت کو کام میں لاکر ناول اور افسانے کی تنقید میں زیادہ ٹھوس، دیرپا اور اہم کام کرسکتے ہیں۔ ان مضامین میں ان کی معلومات اور ادبی بصیرت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان خصوصیات کو کسی بڑی تعمیر کے لیے بروئے کار لایا جائے۔

اس مجموعۂ مضامین کا سب سے اہم، دلچسپ اور فکر انگیز حصہ وہ اوراق ہیں جو "ایک ادبی ڈائری" سے منتخب کئے گئے ہیں۔ ان اوراق میں اختر انصاری کی پوری شخصیت اپنی انفرادیت کی آب و تاب، اپنی متنوع دلچسپیوں اور وسعتِ مطالعہ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان اوراق میں ایک تخلیقی فنکار کی شاعرانہ گوئی اور نقاد کی بصیرت دونوں نے مل کر تنقید میں بھی تخلیق کی شان پیدا کردی ہے۔ یہ مجموعہ ادب کے طالب علموں اور استادوں کے لیے یکساں طور پر مفید اور معلومات افزا ثابت ہوگا۔ اس کے مطالعے سے ہمیں اپنی تنقید کے ان راستوں کا علم ہوتا ہے جن سے اردو تنقید اپنے سفر میں گزری ہے۔

ادب کے ایک مخلص قاری کو ان دونوں کتابوں کی قدر کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسے ادیب کی تخلیقی کاوشیں ہیں جس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ ادب اور صرف ادب کی خدمت میں صرف کیا ہے۔ یہ احساس ہی کتنا خوشگوار ہے کہ ہمارے یہاں کچھ ادیب تو ایسے ہیں جن کا قلم چالیس برس تک مسلسل چلتے رہنے کے باوجود آج بھی رواں اور جواں ہے۔

باقی صفحہ ۷ سے آگے

اور جو کچھ تو ان بزرگوں سے وراثت میں ملی ہے۔ نئے اور پرانے مذاقِ سخن کی آویزش میں دوسرے لوگوں کا جو بھی رد عمل ہو ہم تو فراق صاحب کی زبانی سے وہ شعر سننا چاہتے ہیں جو اکثر ان کے دوست مجنوں گورکھپوری کی زبان پر ہوتا ہے یعنی ؎

پیو شراب جوانی کا موسم گل ہے
ہمیں بھی یاد وہ عہدِ شباب آتا ہے

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا